بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عصمتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

(پہلی تقریر)

عصرِ حاضر میں کچھ لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم معصوم نہیں تھے بلکہ گناہگار تھے (نعوذ باللہ من ذٰلک)۔

بدقسمتی سے اس قسم کے توہین آمیز و گستاخانہ کلمات ان لوگوں کی زبانوں سے نکلتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ بھی پڑھتے ہیں۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحران ہوگیا تھا اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ بڑے بھائی کے برابر ہے۔

اس قسم کے اقوال کفر کے کلمات ہیں بلکہ کفر سے بھی بدتر ہیں۔

سیاسی اسلام جہاں بھی ہوتا ہے وہاں اس قسم کے نظریات اور کفریہ کلمات لوگوں کی زبانوں سے نکلتے رہتے ہیں اور حقیقی اسلام سے لاعلمی کی وجہ سے جو شخص جو کچھ چاہتا ہے کہہ دیتا ہے۔ کوئی اس کی زبان پکڑنے والا نہیں ہوتا۔

بدقسمتی سے یہ سب کچھ فہمِ قرآنِ مجید کے زعم میں ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا ہاتھ ان مترجمین و مفسرین کا ہے جنہوں نے قرآن مجید کے غلط ترجمے کئے اور یہ تک نہیں سوچا کہ لوگ خصوصاً غیر مسلمین ان ترجموں اور تفاسیر کو پڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

غلطیاں بہرحال غلطیاں ہوتی ہیں خواہ وہ کسی سے بھی سرزد کیوں نہ ہوں اس سلسلہ میں سب سے زیادہ حیرت ان مصنفین و مؤلفین پر ہوتی ہے جو محض مکھی پر مکھی مارنے پر اکتفا کرتے ہیں اور غلط ترجموں کو ہی نقل کرتے رہتے ہیں جو ان کے پیش رو کرتے چلے آئے۔

الغرض قرآن مجید کی بعض آیات کے غلط ترجموں کے سہارے بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم نہیں تھے بلکہ گناہگار تھے۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

ذیل میں ہم وہ آیات پیش کر رہے ہیں جن کے ترجمے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند مرتبہ و مقام اور آپ کی ذاتِ مقدس کے شایانِ شان نہیں کئے گئے۔

قبل اس کے کہ ہم صحیح ترجمے پیش کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان آیات کے وہ ترجمے پیش کریں جن کی بنیاد پر یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گناہگار کہتے ہیں۔

آیاتِ ربّانی	غلط ترجمہ
إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ○ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ○ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ○ (الفتح ـ ۱ تا ۳)	(اے رسول) ہم نے آپ کو کھلی فتح دی تاکہ اللہ آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کر دے، آپ پر اپنی نعمت پوری کر دے، آپ کو سیدھے راستہ پر چلا کر منزل مقصود پر پہنچائے اور آپ کی بڑی زور دار مدد فرمائے۔

آیت مذکورہ بالا میں خط کشیدہ عبارت کا ترجمہ قابلِ غور ہے۔

عام طور پر لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ کا ترجمہ یہی کیا جاتا رہا ہے کہ

"تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے تمام گناہوں کو معاف کر دے جو پہلے ہو چکے اور جو بعد میں ہونگے"

اب ترجمے خواہ اردو زبان کے ہوں یا کسی اور زبان کے بہر حال ان ترجموں سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ انتہائی مضحکہ خیز ہے۔

یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ فتح اس لئے دی ہے کہ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے۔ ظاہر ہے کہ جب ذَنبٌ کے معنی گناہ کر دئے جائیں تو اس کا مفہوم بھی صاف واضح ہو جاتا ہے کہ استغفراللہ من ذٰلک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آیت مذکورہ کے نزول سے پہلے بھی گناہ گار تھے اور بعد میں بھی گناہ کرتے رہے۔

کیا اس قسم کے ترجمے غیر شعوری طور پر نبوّت پر چوٹ نہیں ہیں؟

لیکن افسوس کہ ذَنبٌ کا ترجمہ کرتے وقت کسی کو بھی خیال نہیں آیا کہ ذَنبٌ کے معنی صرف گناہ ہی کے نہیں کچھ اور معنی بھی ہو سکتے ہیں۔

ذَنبٌ کے معنی کسی کے پیچھے لگ جانا پھر اس کا پیچھا نہ چھوڑنا، دُم پکڑنا، الزام لگانا یا بیہودہ کام جس کا انجام برا ہو وغیرہ۔

جب ذَنبٌ کے معنی گناہ کے علاوہ اور بھی ہیں تو دوسرے معنوں سے کسی ایک معنی کو چن کر بھی ترجمے کئے جا سکتے تھے تاکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور مرتبہ پر چوٹ نہ پڑتی۔

بہر حال ان مترجمین اور مفسرین کو ایک مرحلے پر سخت مشکل یہ پیش آئی کہ وہ ذَنبٌ کا ترجمہ گناہ کرنے کے بعد یہ نہ بتا سکے کہ فتح سے گناہ کیسے معاف ہوتے ہیں؟

علی بن ابراہیم قمی نے اپنی تفسیر میں (جو تفسیر قمی کہلاتی ہے) اور فضل بن حسن طبرسی نے اپنی

تفسیر (جو تفسیر طبرسی کے نام سے مشہور ہے) میں حضرت امام جعفر صادقؒ کا ایک اچھا قول نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا:۔

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی گناہ کیا اور نہ کبھی گناہ کا خیال دل میں آیا یہ تو آپؐ کے شیعوں کے گناہ ہیں جن کو بخشا گیا ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کے گناہ معاف کئے گئے ہیں"

یہ دونوں مفسرین شیعہ عالم ہیں انہوں نے احترام کو ملحوظ رکھ کر امام جعفر صادقؒ کا قول نقل کیا ہے۔

اسی طرح احمد رضا خان صاحب بریلوی نے بھی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے امام جعفر صادقؒ کی روش کو اختیار کرتے ہوئے ترجمہ کیا ہے لیکن تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ انہوں نے آیت مذکورہ کا جو ترجمہ کیا ہے وہ اس طرح ہے:۔

"بے شک ہم نے تمہارے لئے روشن فتح فرما دی تاکہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں کے اور تمہارے پچھلوں کے"

امام جعفر صادقؒ اور احمد رضا خان صاحب کے ترجموں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے احتراماً ایسا کیا ہے بہر حال دونوں ترجموں میں کچھ تحریف معنوی ضرور ہے لیکن ایک اچھے جذبہ کے ساتھ۔

اس کے برعکس دوسرے مترجمین مثلاً مولوی محمود الحسن صاحب دیوبندی، ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی اور اشرف علی صاحب تھانوی وغیرہ نے احترام ملحوظ نہیں رکھا اور صاف صاف یہ ترجمہ کیا ہے آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے۔

ان لوگوں کے ترجموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم گناہ گار تھے معصوم نہیں تھے العیاذ باللہ۔

الغرض فتح یا صلح سے گناہ کس لئے معاف ہو رہے ہیں اس کا جواب تو وہ بھی نہ دے سکے جنہوں نے احترام کو ملحوظ رکھ کر ترجمے کئے ہیں اور یہ ایک ایسا معمہ تھا جسے کوئی حل نہ کر سکا۔

باادب مترجمین کے ترجموں کو تسلیم کر لیا جائے کہ اگلی اور پچھلی امت کے گناہ معاف ہو گئے تو حیرت انگیز بات یہ سامنے آتی ہے کہ امت کے لئے گناہ کا تو کوئی وجود ہی باقی نہیں رہا۔ ظاہر ہے جب ساری امت بخش دی گئی تو گناہ تو ایک بے حقیقت چیز بن کر رہ گیا نہ اگلا کوئی گناہ باقی رہا نہ پچھلا کوئی گناہ باقی رہا سب بخش دیئے گئے تو گویا ساری امت گناہوں سے پاک و صاف ہو گئی۔

الغرض فتح سے گناہ کا معاف ہونا اور گناہ کا وجود بے معنی ہو جانا یہ دونوں معمے کوئی حل نہیں

کرسکا۔

اس حقیقت کو ذہن میں رکھیئے کہ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کسی لفظ کے ایک ہی معنی نہیں ہوتے بلکہ کئی کئی معنی ہوتے ہیں۔

مثلاً۔ مثال (۱) رَجُوٌ ۔ یہ مصدر ہے اس کے معنی امید کرنے کے بھی ہیں اور ڈرنے کے بھی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيْرًا ○ (احزاب ـ ۲۱)

تم لوگوں کے لئے جو اللہ سے اور قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے ہیں اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

آیتِ مذکورہ میں " یَرْجُوا " ۔ رَجُوٌ سے مضارع کا صیغہ ہے اس آیت میں اس کے معنی ہیں، " وہ ڈرتا ہے ۔"

اگر اس کے معنی امید رکھنے کے کئے جائیں تو آیت کا ترجمہ غلط ہی نہیں بلکہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب دوسری آیت ملاحظہ فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللهِ (البقرۃ ـ ۲۱۸)

جو لوگ ایمان لائے اور جن لوگوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے رہے یہ لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہاں " یَرْجُوْنَ " کے معنی ڈرنے کے نہیں کئے گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت امید کی متقاضی ہے نہ کہ ڈرنے کی۔

آپ نے دیکھا کہ ایک ہی لفظ کے دو معنی کئے گئے ہیں ایک جگہ " ڈرنا " اور دوسری جگہ " امید رکھنا "۔ حالانکہ ڈر اور امید ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دونوں معنوں میں گہرا تضاد موجود ہے لیکن دونوں معنی متکلم کے منشا اور محل کے اعتبار سے بالکل صحیح ہیں۔

مثال (۲)

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ○ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ○ (الکافرون ـ ۱)

کہہ دیجئے اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو۔

یہاں کافروں سے مراد کون سے کافر ہیں ؟

مذکورہ خطاب میں وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ یعنی اس آیت میں

"کافرون" کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اسلام نہیں لائے اب دوسری آیت ملاحظہ فرمایئے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ (البقرۃ - ۶)	جو لوگ کافر ہیں اے رسول آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اگر دوسری آیت میں کافروں سے مراد ہر قسم کے کافر ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ یہ خبر صحیح نہیں نکلی کیونکہ قرآن مجید کی آیت ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ بہت سے کافر ایمان لے آئے۔
اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :-

یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ (سورۃ النصر - ۲)	فوجوں کی فوجیں اللہ کے دین میں داخل ہو رہی ہیں۔

آپ نے غور فرمایا یہ کیسا تضاد ہے اور کیوں ہے ؟
اللہ تعالیٰ ہی خبر دے رہا ہے کہ کافر ایمان نہیں لائیں گے اور اللہ تعالیٰ ہی خبر دے رہا ہے کہ کافر اسلام میں جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں۔
مذکورہ آیات ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ کفر کے معنی دونوں جگہ ایک نہیں ہو سکتے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کفر کے معنی انکار کے بھی ہیں اور چھپانے کے بھی ہیں۔
پہلی آیت میں "کَافِرُوْنَ" سے مراد عام کافر ہیں جنہوں نے سرے سے اسلام قبول نہیں کیا، دوسری آیت میں کافروں سے مراد حق پوش انسان ہیں۔
الغرض "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کو چھپاتے ہیں، حق پوشی کرتے ہیں؟ ہٹ دھرمی کرتے ہیں لہٰذا سورہ بقرۃ کی آیت ۶ کا ترجمہ یہ ہوا "جو لوگ حق کو چھپاتے ہیں اے رسول آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔"
غور فرمایئے جب ایک ہی لفظ کے معنی کافر بھی ہوتے ہیں اور حق چھپانے والے کے بھی ہوتے ہیں تو پھر ان مترجمین اور مفسرین نے کیوں نہ سوچا کہ آخر "ذنب" کے کچھ اور معنی بھی ہو سکتے ہیں۔
انہوں نے دوسرے معنی و مفہوم کو اختیار کیوں نہیں کیا اور "ذَنْبٌ" کے معنی صرف گناہ ہی کے کیوں کئے؟ پھر خصوصًا ایسی صورت میں جبکہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے احترام اور آپ کی معصومیت کا ہو، آخر احترام اور معصومیت دونوں کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بھول سے ایک ذرا سی لغزش ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ (طٰہٰ - ۱۱۵)

ہم نے پہلے آدم سے ایک عہد لیا تھا لیکن وہ بھول گئے۔

یعنی حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اللہ تعالیٰ نے جو عہد لیا تھا وہ یہ تھا کہ اس درخت کے پاس نہ جائیں لیکن وہ بھول گئے اور بھولے سے اس درخت میں سے کھالیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بھول چوک کو بھی معاف نہیں کیا بلکہ خفگی کا اظہار کیا۔

ذرا غور کیجئے کہ آدم علیہ السلام کی بھول پر خفگی کا اظہار کیا گیا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھلے اور آئندہ ہونے والے گناہ بھی معاف کئے جارہے ہیں اور خفگی کا نام ونشان تک نہیں کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے ؟

اس سلسلہ میں ایک اور مثال بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حسنِ ظن کی بنیاد پر ایک لغزش ہوئی لیکن معاف نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (الانبیآء - ۸۷)

انہیں (ہمارے متعلق) یہ (حُسن) ظن تھا کہ ہم (ان کے اس طرح حکمِ الٰہی کے بغیر چلے جانے پر) ان کی گرفت نہیں کریں گے۔

حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خیال تھا کہ میرے اس طرح چلے جانے سے اللہ تعالیٰ میری پکڑ نہیں کریگا۔

ہوتا یہی ہے اور یہ دستور رہا ہے کہ جب کسی قوم پر عذاب آنے والا ہوتا ہے تو اس قوم کا نبی اس بستی کو چھوڑ دیتا ہے۔

حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی دستور کے مطابق عمل کیا لیکن ان سے لغزش صرف یہ ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کئے بغیر ہی اپنا مستقر چھوڑ بیٹھے نتیجہ جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

بتائیے ایک نبی تو محض حسن ظن کی بناء پر خفگی کا مستحق ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر گناہ پر گناہ کرتے رہے اور کوئی گرفت نہیں کی گئی۔

ان مثالوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ غلط ترجمے اور غلط تشریحات آیت کے معانی ومفہوم کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔

اب ذَنبٌ کے اصلی اور حقیقی معنی ملاحظہ فرمایئے۔

ذنب کے معنی | ذنب کے معنی ہر وہ کام جس کا انجام برا ہو (مفردات امام راغب)

گناہ کو ذنب اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کا انجام بُرا ہوتا ہے۔

ذنب کے دوسرے معنی : الزام لگانا ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ الزام کا انجام بھی برا ہوتا ہے کیونکہ جس پر الزام لگایا جاتا ہے لوگ اس سے متنفر ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کے شکوک میں مبتلا ہو کر اس کی حق بات کو سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔

اسی طرح غَفرٌ کے معنی بھی غلط کئے گئے۔

غَفرٌ | غفر کے معنی ڈھانکنے اور چھپانے کے بھی ہیں۔ غُفرَۃٌ اس سرپوش کو کہتے ہیں جو برتن کو چھپائے یا ڈھانک دے۔

غفر کے معنی بچانے کے بھی ہیں اور غفر کے معنی درست کرنا، اصلاح کرنا اور ازالہ کرنے کے بھی ہیں۔

غِفارہ : اس کپڑے کو کہتے ہیں جو دوپٹہ کو تیل وغیرہ سے بچانے کے لئے خواتین اپنے سر پر باندھ لیتی ہیں۔

مِغفَر : خود کو کہتے ہیں جو سر کو تلوار کے وار سے بچاتا ہے۔

اس تفصیلی وضاحت کے بعد اب آیت کا صحیح ترجمہ ملاحظہ فرمایئے :-

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ۝ (فتح - ۳۱)

(اے رسول) ہم نے آپ کو فتح مبین دی تاکہ اللہ آپ پر لگائے گئے اگلے پچھلے تمام الزامات کی اصلاح فرمائے اور آپ پر اپنی نعمت پوری کر دے اور آپ کو سیدھے راستہ پر چلاتا رہے۔ (بے شک) اللہ آپ کی (ہر موقع پر) زبردست مدد کرے گا۔

مذکورہ بالا ترجمہ کے صحیح ہونے کا ایک خاص تاریخی پس منظر بھی ہے۔

کفارِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر استہزائیہ انداز میں اور فخر کے زعم میں طرح طرح کے الزامات لگائے تھے مثلاً

کسی نے آپ کو مجنون کہا، کسی نے شاعر کہا، کسی نے جادوگر، کسی نے مسحور (یعنی کسی نے آپ پر جادو کر دیا ہے) کسی نے کاہن کہا۔

الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی قبیل کے بہت سے الزامات لگائے گئے۔
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صلح سے الزامات کے ازالے کا کیا تعلق ہے؟
آپ اس حقیقت کو ذہن میں رکھیں کہ کسی پر الزامات یا اس کی برائیاں اس کی غیر حاضری میں بیان کی جاتی ہیں اور غیر حاضری ہی میں لوگ ان الزامات کو ایک دوسرے تک سینہ بہ سینہ پہنچاتے رہتے ہیں۔

کفار مکہ نے مذکورہ الزامات کو خوب شہرت دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

صلح ہو جانے کے بعد لوگ ایک دوسرے سے ملاقات کرنے لگے۔ ملاقات کے ذریعہ الزامات کا ازالہ ہوتا چلا گیا۔ اگلے پچھلے تمام الزامات کی صفائی ہو گئی۔ اس فتح مبین سے نہ صرف ان الزامات کا ازالہ ہوا بلکہ تبلیغ دین کے لئے جو رکاوٹیں تھیں وہ بھی دور ہو گئیں اور تبلیغ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس صلح میں جو حکمت اور مصلحت پوشیدہ تھی وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے بے شمار خوشیوں اور جنت کی نوید کا باعث بنی۔

صلح حدیبیہ پر تبصرہ | (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ بظاہر دب کر صلح کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں بڑی مصلحت تھی۔ مثلاً یہ صلح ہی دراصل فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ تبلیغ کے لئے میدان صاف ہو گیا۔ مکہ مکرمہ کے مظلوم مسلمین لاعلمی میں قتل ہونے سے بچ گئے۔ اس اثناء میں بہت سے کافر مسلم ہو گئے وغیرہ وغیرہ۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء ہی میں مشورہ لیتے وقت فرمایا تھا "کیا تمہاری رائے ہے کہ میں ان کافروں کو جا کر غارت کر دوں"۔ پھر آپ نے صحابہ کرامؓ سے لڑنے اور مرنے پر بیعت لے کر جنگ کا ارادہ فرما لیا تھا آپ نے بدیل اور عروہ سے بھی جنگ کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا اور آپ کسی طرح بھی ان سے خوفزدہ نہیں تھے، اللہ تعالٰی کے ارشادات سے بھی یہی واضح ہوتا ہے، مثلاً:۔

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ (فتح - ۲۲)	اگر کافر تم سے لڑتے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے۔
اَنْ تَطَــُٔوْهُمْ (فتح - ۲۵)	تم ان کو پامال کر دیتے۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دب کر صلح کسی کمزوری یا بزدلی کی وجہ سے نہیں کی گئی تھی۔

(۳) یہ صلح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرضی سے نہیں کی بلکہ اللہ کے حکم سے کی جیسا کہ آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا تھا کہ "میں اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتا"۔ پھر بعد میں اللہ تعالٰی نے

سورۂ فتح میں اس کی تائید کردی۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے اس فتح مبین کے سلسلہ میں صحابۂ کرامؓ کے لئے بھی بہت سی خوشخبریوں کے ساتھ ان کے دلوں پر جو سکینہ نازل فرمایا تھا وہ تحمل اور قوت برداشت ہی تو تھی جس نے ان کے جوشِ انتقام کو ٹھنڈا کر دیا اور اُن کو تقوے کی بات پر قائم رکھا اور وہ اسی کے مستحق اور اہل بھی تھے اور اللہ (نہ صرف ان کے تقوے سے باخبر ہے بلکہ وہ) ہر چیز سے واقف ہے۔

اس ہی بنیاد پر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ ہی کو فتح کہا۔

مزید برآں اس صلح سے جو آئندہ کامرانیاں ظہور میں آئیں وہ یہ کہ

(۵) صرف تین ماہ بعد خیبر فتح ہوا۔

(۶) دو سال بعد آٹھ ہزار مسلمین نے مکہ پر حملہ کیا اور مکہ فتح ہوا۔

(۷) پھر جو فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو حنین، طائف اور اوطاس فتح ہوئے اسکے بعد

(۸) غزوۂ موتہ میں قیصر سے جنگ ہوئی اور فتح ہوئی۔

(۹) پھر جب خلفائے راشدین کا دور آیا تو انہوں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے۔

یہ سب کیا تھا؟ یہ اسی صلح حدیبیہ کے نتائج و ثمرات تھے جو بظاہر دب کر کی گئی تھی۔

الغرض صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں یہ مختصر سی وضاحت ہے اس سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لئے "تاریخ الاسلام والمسلمین" ملاحظہ فرمایئے۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ کیا یہ فتح مبین محض اس لئے دی گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھلے اور آئندہ ہونے والے گناہ معاف کر دیے جائیں۔

کاش کہ مترجمین و مفسرین قرآن مجید کی آیات و احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ محسوس کرتے کہ ان کے غلط ترجمے کس قدر غلط نتائج پیدا کر رہے ہیں۔

ایک طرف تو قرآن مجید کی بے شمار آیات و احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس کو دوبالا کرتے ہوئے انہیں معصوم عن الخطاء باور کرا رہی ہیں اور دوسری طرف انہیں گناہ گار باور کرایا جا رہا ہے۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

① وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (ق ۔ ۴)

(اے رسول) بے شک آپ عظیم الشان اخلاق پر فائز ہیں۔

② قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۔ ۳۱)

(اے رسول آپ کہہ دیجئے) اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ ہے تو میری اتباع کرو پھر اللہ تم سے محبت کرے گا۔

③ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ (الاعراف - ۱۵۸)
رسول کی پیروی کرو تاکہ تمہیں ہدایت مل جائے۔

④ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (الزخرف - ۴۳)
(اے رسول) آپ سیدھے راستے پر ہیں۔

⑤ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ (النور - ۵۶)
اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

⑥ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النسآء - ۸۰)
جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے (دراصل) اللہ ہی کی اطاعت کی۔

حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہؓ فرماتی ہیں :-

⑦ اِنَّ خُلُقَ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ الْقُرْاٰنَ۔ (صحیح مسلم)
اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا (یعنی وہ تمام اخلاق حسنہ واوصاف حمیدہ جو قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں آپ میں بدرجہ اتم موجود تھے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

⑧ وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ۔ (صحیح بخاری کتاب النکاح باب الترغیب فی النکاح)
اللہ کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اللہ کی نافرمانی سے بچنے والا ہوں۔

یہ چند آیات واحادیث آپ کے سامنے ہیں غور فرمائیے کہ اس قدر جامع اوصاف وکامل ہستی جو سب سے زیادہ متقی و پرہیز گار اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے والی اور صراطِ مستقیم پر قائم ہو جس کی پیروی سے ہدایت وکامرانی ملتی ہو جس کی زندگی ہمارے لئے کامل نمونہ ہو بھلا ایسی معصوم ہستی گناہ گار بھی ہو سکتی ہے؟ گناہ گار نمونہ نہیں بن سکتا۔

غلط معنی ومفہوم اخذ کرنے کے سلسلہ میں گذشتہ اوراق میں جو کچھ بتایا گیا اسی پر اکتفا نہیں بلکہ غلط تراجم کے سلسلہ میں مزید کئی اور مثالیں موجود ہیں۔ سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں بھی یہی روش اختیار کی گئی ہے مثلاً :-

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے :-

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ○ (نجم - ۱)
قسم ہے تارے کی جب وہ بلند ہو جائے۔

مذکورہ بالا ترجمہ جو کہ صحیح ترجمہ ہے اس کے برعکس بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے :-

"قسم ہے تارے کی جب وہ گرے"۔ کیا ہی عجیب وغریب ترجمہ ہے۔
سورہ نجم کی ابتدائی آیات معراج کے متعلق ہیں۔ ان آیات میں ہی ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی ۝ (نجم - ۱۸)
انہوں نے اپنے ربّ (کی قدرت) کی کتنی ہی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔
غور فرمایئے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو عروج و بلندی پر جا رہے ہیں اور ترجمہ کیا گیا گرنے کا۔ کیا یہ مضحکہ خیز ترجمہ نہیں ہے؟
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تو کتنی بلندیوں پر آپ تشریف لے گئے یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے ہم اس معجزاتی بلندیوں کا ادراک نہیں کر سکتے۔
اب اس سے اگلی آیت کا ترجمہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔
مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی ۝ (نجم - ۱۹)
تمہارے صاحب (ساتھی) نہ راستہ بھولے اور نہ بھٹکے۔
بتایئے جو شخص نہ بھولا ہوا ور نہ بھٹکا ہو وہ گناہگار ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔
عموماً انسان شیطان کے بہکائے میں آکر بہک جاتا ہے اور غلطی کر بیٹھتا ہے حتیٰ کہ گناہ بھی کر بیٹھتا ہے لیکن صحیح مسلم کی ایک حدیث کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم شیطان کے مکرو فریب سے مستثنیٰ ہیں یعنی شیطان انہیں نہیں بہکا سکتا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔
تم میں سے ہر شخص کے ساتھ جنّات میں سے ایک ساتھی متعین ہوتا ہے۔
صحابہؓ نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول کیا آپ کے ساتھ بھی شیطان ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں میرے ساتھ بھی (شیطان) ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی کہ وہ مسلم ہو گیا ہے لہٰذا وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کہتا سوائے نیکی کے۔ (صحیح مسلم کتاب صفۃ القیامۃ باب تحریش الشیطان)
اس سلسلہ کی دوسری حدیث بھی ملاحظہ فرمایئے :۔
حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہؓ فرماتی ہیں :۔
(ایک دن) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: کیا تمہارے پاس شیطان آیا تھا؟
میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول کیا میرے ساتھ بھی شیطان ہے؟ فرمایا: ہاں۔
میں نے پوچھا: کیا تمام انسانوں کے ساتھ شیطان ہوتا ہے؟ فرمایا: ہاں۔

میں نے پھر پوچھا: اے اللہ کے رسول کیا آپ کے ساتھ بھی شیطان ہے ؟
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں میرے ساتھ بھی شیطان ہے لیکن میرے رب نے میری مدد فرمائی وہ مسلم ہوگیا ہے (صحیح مسلم کتاب صفۃ القیامۃ باب تحریش الشیطان)
بتایئے روئے زمین پر کوئی ایسی ہستی ہے جو شیطان کے مکر و فریب سے محفوظ و سلامت ہو۔
غور فرمایئے اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں ان کے معصوم عن الخطاء ہونے کی کیسی سند نازل فرما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۝ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ (نجم ۳-۴)

(یہ رسول) اپنی خواہش نفس سے کوئی بات نہیں کہتے وہ تو وہی بات کہتے ہیں جو ان کی طرف وحی کی جاتی ہے۔

الغرض شیطان بھی مسلم، زبان بھی صحیح و محتاط بلکہ خواہشاتِ نفسانی سے قطعی ماوراء کہ کوئی کلمہ زبان سے غلط نکلنے کا امکان ہی نہیں تو پھر خطاء و نسیان یا بھول چوک یا گناہ کا معاف کیا جانا قرآن مجید کی بڑی عجیب و غریب ترجمانی ہے۔

جب ہر بات ہر فعل منشائے الٰہی کے عین مطابق ہو تو وہ ہستی معصوم عن الخطاء ہوتی ہے نہ کہ گناہگار۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے لوگوں نے کہا کہ آپ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات نہ لکھا کریں کیونکہ کبھی آپ خوش ہوتے ہیں اور کبھی ناراض ہوتے ہیں (لہٰذا) انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا اور آپ سے پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اُکْتُبْ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ مَا یَخْرُجُ مِنْہُ اِلَّا حَقٌّ۔ (رواہ ابوداؤد کتاب العلم۔ صححہ الحاکم والذھبی۔ حاکم ۱/۱۰۵)

تم لکھا کرو قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

بتایئے ایسے باکمال، ہمہ صفات موصوف اور بے مثال نبی امّی رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم جو اپنے بیان میں قطعی معصوم ہوں اور گناہ تو بڑی چیز ہے جن کے دل میں شیطان کے مسلم ہوجانے کی وجہ سے گناہ کا تصوّر تک نہ آئے ایسی ہستی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ گناہ گار تھے یقیناً کفر ہے بلکہ کفر سے بھی بدتر۔

مرتب : محمد یوسف۔ مدیر "المسلم"

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عصمتِ رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم

(دوسری تقریر)

تراجم کے سلسلہ میں بعض سنگین غلطیوں کی نشاندہی گذشتہ تقریر میں کی گئی تھی آج مزید غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰیٓ ○ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ○ وَمَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰیٓ ○ (عبس ۔ ۱ تا ۳)

تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا اس لئے کہ اس کے پاس ایک نابینا آگیا اور (اے رسول) آپ کو علم نہیں شاید وہ پاکی حاصل کرتا۔

مندرجہ بالا ترجمہ وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر مترجمین و مفسرین کرتے چلے آئے ہیں۔ مذکورہ بالا آیات کا ترجمہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور ایسا ترجمہ کیا گیا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نعوذ باللہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم معصوم نہیں تھے بلکہ گناہ گار اور بد اخلاق تھے۔ آپ نے ایک نابینا صحابی عبداللہ ابن ام مکتومؓ کی آمد پر تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔

اصل حقیقت کیا ہے اور اس قسم کا ترجمہ کیوں کیا گیا ہے ؟ اس کا ایک پس منظر ہے وہ پس منظر مذکورہ بالا آیات کے شانِ نزول میں بیان کیا گیا ہے۔ اس شانِ نزول کو بیان کرنے والے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس شانِ نزول میں " عَبَسَ وَ تَوَلّٰی " کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔

حیرت ہے سب مکھی پر مکھی مارتے چلے گئے۔ کسی نے یہ تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ والی روایت کی سند کیسی ہے ؟

اس روایت کو حافظ عمادالدین ابن کثیرؒ نے بحوالہ تفسیر ابن ابی حاتم اور بحوالہ تفسیر طبری نقل کیا ہے۔

اس روایت کی سند میں ایک راوی عطیۃ العوفی ہے جو امام یحییٰ کے نزدیک ابوہارون اور بشر بن حرب کے مثل ہے (تہذیب)

ابوہارون کذّاب ہے، امام بخاری فرماتے ہیں ابوہارون کذّاب ہے (جزء القراءۃ للبیہقی ص۱۳۵)۔ امام نسائی فرماتے ہیں :۔ متروک الحدیث ہے۔ حماد بن زید، جوزجانی، ابن معین، ابن

عُلیّہ اور عثمان بن ابی شیبہ نے کہا کذّاب ہے۔ حضرت عثمانؓ کو کافر سمجھتا تھا (تہذیب جلد ۷ صـ ۲۱۳)

بشر بن حرب کے متعلق ابن خراش کہتے ہیں متروک ہے اور متروک وہ راوی ہوتا ہے جس پر جھوٹ کی تہمت ہو۔ یحییٰ القطان نے اسے ترک کر دیا تھا۔

کیونکہ عطیہ العوفی ابو ہارون اور بشر بن حرب کے مثل ہے لہٰذا وہ بھی انتہائی ضعیف ہوا بلکہ کذّاب ہوا۔ امام احمد، امام نسائی، امام ہشیم اور امام ابو حاتم نے اسے ضعیف کہا۔ امام ابوداؤد نے کہا اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حضرت علیؓ کو کل لوگوں پر فضیلت دیتا تھا (تہذیب جلد ۷ صـ ۲۲۵)

طبری کی سند اس طرح ہے: حدثنی محمد بن سعد قال ثنی ابی قال ثنی عمی قال ثنی ابی عن ابیہ۔

بھلا یہ بھی کوئی سند ہے: مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا، ان سے ان کے چچا نے بیان کیا، ان سے ان کے باپ نے بیان کیا اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا۔

یہ سند کیا ہے ایک لا لنگر ہے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ راوی کون تھے؟ حافظ ابن کثیرؒ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے متعلق لکھتے ہیں:۔

اس میں غرابت ہے، نکارت ہے اور اس کی سند میں کلام کیا گیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جزء ۴ صـ ۴۷)

الغرض یہ روایت سنداً باطل ہے اسی باطل روایت کی بنیاد پر گاڑی آگے چلتی رہی۔

شانِ نزول کے متعلق دو روایتیں اور ہیں۔ ایک حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہ سے مروی ہے اور دوسری حضرت انسؓ سے۔

حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہؓ کی روایت میں عَبَسَ وَتَوَلّٰی کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بتایا گیا اور نہ حضرت انسؓ کی روایت میں عَبَسَ کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہ کی روایت میں "اَعْرَضَ" کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے لیکن یہ روایت مرسل ہے۔ امام حاکم لکھتے ہیں: ارسلہ جماعۃ عن ھشام بن عروۃ یعنی محدثین کی ایک جماعت نے اسے ہشام بن عروہؓ سے مرسل بیان کیا ہے۔

امام ذہبی لکھتے ہیں " وھو الصواب " اور یہی صحیح ہے (حاکم ۲/۵۱۴) یعنی اس کا

مرسل ہونا ہی صحیح ہے۔

الغرض اس روایت کا متن ہشام کا قول ہے، حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہ تک اس کی سند نہیں پہنچتی لہٰذا حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہ رضی کی یہ روایت کالعدم ہے۔

حضرت انس رضی کی روایت کا متن یہ ہے:۔

جاء ابن ام مکتوم الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یکلم ابی بن خلف فاعرض عنہ فانزل اللہ " عَبَسَ وَتَوَلّٰى " (مسند ابی یعلیٰ جزء ۵ ص۴۳۲) بسندٍ صحیح۔

ابن ام مکتوم رضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے آپ اس وقت ابی بن خلف سے بات کر رہے تھے۔ اس نے ان سے اعراض کیا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی "عَبَسَ وَتَوَلّٰى"

اَعْرَضَ کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہوسکتے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت شریفہ نہیں تھی کہ کسی غریب آدمی کا آپ کے پاس کھڑا ہونا یا بیٹھنا آپ کو ناگوار گذرے۔ یہ تو رؤسائے مشرکین کی عادت تھی، انہوں نے ہی کہا تھا " اُطْرُدْ هٰؤُلَآءِ " ان غریب آدمیوں کو اپنی مجلس سے نکال دیجئے۔ ان کے اس مطالبہ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (صحیح مسلم کتاب الفضائل باب فی فضل سعد بن ابی وقاصؓ جزء ۲ ص۲۶۵)	اور (اے رسول) ان لوگوں کو جو اپنے رب کو صبح وشام پکارتے رہتے ہیں (اپنی مجلس سے) نہ نکالیئے۔

خلاصہ حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہ رضی کی روایت مرسل ہونے کی وجہ سے کالعدم ہے۔ مزید برآں اس میں " عَبَسَ " کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بتایا گیا اور نہ اس میں عتاب کا ذکر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی کی روایت سنداً باطل ہے۔ اس روایت میں بھی عتاب کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ عتاب کا شاخسانہ فرضی ہے۔ حقیقت کچھ نہیں۔ اب آیئے اصل حقیقت کی طرف۔

حضرت انس رضی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ایک رئیس کو تبلیغ کر رہے تھے۔ اسی دوران عبداللہ ابن ام مکتوم رضی آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے کوئی سوال کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جواب نہیں دیا اور رئیسِ مکہ ہی کو تبلیغ کرتے رہے۔ اُس رئیس نے ایک غریب آدمی کو اپنے پاس کھڑا دیکھ کر تیوری چڑھائی اور منہ موڑ کر چلا گیا۔ ایسے موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں:

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝	(اس کافر نے) تیوری چڑھائی اور پیٹھ موڑ کر

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى ۝
(عبس ۔ ۱ تا ۳)

چلا گیا جبکہ اس کے پاس ایک نابینا آیا۔ (اے رسول) آپ کو نہیں معلوم کہ (وہ کافر تو راہِ راست پر آنے والا نہیں البتہ) شاید یہ نابینا پاکی حاصل کرتا۔

یہ ہے اصل حقیقت۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ تیوری چڑھانے کا ذکر ہے اور نہ عتاب کا۔ مزید برآں اللہ تعالٰے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم توجہی کو بھی حکایتاً بیان کیا ہے۔ صراحتاً کوئی حکم نہیں دیا۔

تبلیغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں شامل تھی اور آپ تبلیغ ہی کر رہے تھے۔ اللہ تبارک و تعالٰی ارشاد فرماتا ہے :۔

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۔
(مآئدہ ۔ ۶۷)

اے رسول آپ کے رب کی طرف سے جو (احکام) آپ پر نازل کئے گئے ہیں انہیں آپ پہنچادیں اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت کو نہیں پہنچایا۔

ایک اور جگہ اللہ تعالٰی ارشاد فرماتا ہے :۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَ اسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ
(شوریٰ ۔ ۱۵)

(اے رسول) آپ اسی (دین) کی طرف ان کو بلاتے رہیئے، جو حکم آپ کو دیا گیا ہے اسی پر قائم رہیئے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے۔

ان آیات سے واضح ہوا کہ حق کی تبلیغ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں شامل تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالٰی کا یہ حکم تھا کہ اس دین کو جو آپ پر نازل کیا جا رہا ہے بے کم و کاست پہنچادیں اور اسی حق کی طرف آپ لوگوں کو دعوت دیتے رہیں اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو گویا آپ نے حق رسالت ادا نہیں کیا۔

بتایئے جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالٰے کے حکم کے مطابق اپنے فرضِ منصبی کو انجام دے رہے تھے تو حکم کی تعمیل گناہ کس طرح ہوگئی؟ گناہ تو نافرمانی سے ہوتا ہے۔

دعوتِ حق اور تبلیغ تو کوئی گناہ کا کام نہیں تھا اور جب گناہ نہیں تھا تو پھر عتاب کا نزول کیا معنی رکھتا ہے؟

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کا دین دنیا کے چپّہ چپّہ پر غالب اور نافذ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (توبہ ۔ ۳۲)	اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کردے ۔

اب اس فریضۂ منصبی کو درجۂ کمال تک پہنچانے کی سعی وجد وجہد میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم رئیسِ مکہ کو تبلیغ کررہے تھے اور رئیسِ مکّہ کے ایمان لانے سے یہ امید تھی کہ بہت سے غریب لوگ بھی اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور اس طرح اسلام کو ایک قوت حاصل ہو جائے گی۔

الغرض یہی وہ حکمت تھی جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ ابن ام مکتومؓ کے سوال کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور آپ کی توجہ کفارِ مکّہ کے رئیس کی طرف مرتکز رہی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل ، دعوت و تبلیغ اور رئیسِ مکّہ کی طرف توجہ کرنا گناہ تھا ؟

اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر عتاب کیسا ؟

عتاب کے نزول کی وجہ علماء نے یہ بتائی ہے کہ کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غریب مسلم کی طرف توجہ نہیں کی اور مکّہ کے رئیس کو ترجیح دی جس کی وجہ سے اس غریب نابینا کو رنج پہنچا۔ اس کا رنجیدہ ہونا ہی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بن گیا اور یہی وجہ عتاب کے نزول کی تھی۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس سے پہلے اس قسم کا کوئی حکم نازل ہو چکا تھا کہ "جب کبھی کوئی مسلم سوال کرنے آئے تو آپ کافروں کو چھوڑ دیں اور مسلم کی طرف توجہ کریں"۔

اگر ایسا کوئی حکم نازل ہو چکا ہوتا تو پھر آپ کا یہ فعل جرم ہوتا اور عتاب بھی نازل ہوتا لیکن حکم تو بعد میں نازل ہوا اور وہ بھی صراحتاً نہیں حکایتاً۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے عدم توجہی کے فعل کو حکایتاً بیان کیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ آپ کو علم نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ	آپ کو علم نہیں کہ شاید وہ پاکی حاصل کرتا۔

بتلائیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم ہی نہیں تھا کہ نابینا صحابیؓ آپ سے پاکی حاصل کرتا اور فائدہ اٹھاتا اور کافر کا بھروسہ نہیں کہ وہ ایمان لائے یا نہ لائے تو جو فعل لاعلمی میں ہو

وہ گناہ کس طرح ہوگا؟ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے فعل کو تو بیان کیا لیکن تنبیہ کچھ نہیں کی۔

آئندہ نافذ ہونے والے کسی حکم کی خلاف ورزی نافرمانی نہیں ہوتی اور جب نافرمانی ہی نہیں ہوتی تو عتاب کیسے نازل ہوتا؟

شراب کی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے جو لوگ شراب پیتے تھے کیا وہ گناہگار ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔

ان آیات کے نزول کے بعد اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ جب کبھی غیر مسلموں کو دعوت دی جائے اور اس دوران کوئی مسلم آجائے تو اس مسلم کو ترجیح دینی ہوگی اور ان غیر مسلم کفار کی خواہ وہ کتنے ہی ذی مرتبہ کیوں نہ ہوں پرواہ نہیں کی جائے گی۔

بد اخلاقی کا جو فعل نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس بہتانِ عظیم پر کسی نے نہ توجہ کی اور نہ تحقیق کی زحمت گوارا کی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت درایتاً بھی غلط ہے اور سنداً بھی غلط ہے بلکہ سنداً جھوٹی ہے۔ ایسی روایت کی بنیاد پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر بہتان لگانا کہ آپ سے بد اخلاقی بھی ہو جایا کرتی تھی اور اسی کی بنیاد پر سورہ عَبَسَ کا غلط ترجمہ کرنا یقیناً قابل مذمت بھی ہے اور قابلِ افسوس بھی۔

مذکورہ ترجمہ اس اعتبار سے بھی باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند اخلاق کی سند نازل فرمائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (نٓ - ۴) (اے رسول) بے شک آپ عظیم (الشان) اخلاق پر فائز ہیں۔

ایسی معرکۃ الآرا سند کی موجودگی میں کسی ایک نے بھی اس گمراہ کن ترجمے کی تردید نہیں کی۔ سب ہی مکھی پر مکھی مارتے چلے گئے حتیٰ کہ احمد رضا خان صاحب بریلوی جو احترام و عقیدت کے معاملے میں بڑے محتاط تھے انہوں نے بھی اس بات کی پرواہ نہ کی اور نہ تردید کی اور وہی ترجمہ کیا جو دوسرے کرتے چلے آئے تھے۔

بعض لوگ ہم پر یہ طعن کرتے ہیں کہ لو جی! یہ بریلویوں سے بھی آگے نکل گئے۔

جی ہاں! ہم یقیناً ادب و احترام کے معاملے میں آگے نکل گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک ادب و احترام بڑی ضروری چیز ہے۔ ہم موحد ضرور ہیں لیکن با ادب۔ اگر احترام و عقیدت میں غلو نہ ہو تو یہ خصوصیت ہر موحد کے لئے ضروری ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ کیا فرماتا ہے:-

وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ اور جو شخص اللہ کی محترم قرار دی ہوئی چیزوں

خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ
(الحج - ۳۰)

کی تعظیم کرے تو یہ اس کے رب کے ہاں اس کے لئے بہتر ہے۔

معلوم ہوا کہ شعائر اللہ کی تعظیم تو ایک خیر ہے اور اس خیر کے حصول کے لئے تعظیم بڑی ضروری چیز ہے لیکن احترام و عقیدت کے لئے جو شرط ہے اسے ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔
اللہ تعالیٰ آگے ارشاد فرماتا ہے :-

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ○
(الحج - ۳۱)

اور جو شخص اللہ کے ساتھ (کسی کو) شریک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر یا تو اس کو پرندے اچک لے جائیں یا ہوا اس کو دور دراز مقام پہ لے جا کر ڈال دے۔

معلوم ہوا کہ ہر حالت میں شرک کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور مشرک کی ہر لحاظ سے کامل بربادی ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ تعظیم و تکریم اور ادب و احترام بھی شرک ہے یہی وجہ ہے کہ اس مثال کے بعد اللہ تعالیٰ اگلی آیت میں فرماتا ہے :-

ذٰلِكَ ، وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ○
(الحج - ۳۲)

یہ (سن چکے تو اب مزید سنو) جو شخص اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ کی علامت ہے۔

ثابت ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کردہ چیزوں کی تعظیم و تکریم کرتا ہے وہی متقی ہے یعنی شعائر اللہ کی تعظیم وہی کرے گا جس کے دل میں تقویٰ ہوگا۔
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہونے کی وجہ سے اللہ کی طرف منسوب ہیں لہٰذا آپ کی تعظیم و تکریم ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی تعظیم و تکریم کی ہمیں تعلیم دی ہے اور قرآن مجید میں اس قسم کی متعدد آیات موجود ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
(الحجرات - ۱)

اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔

(۲) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ

اے ایمان والو نبی کی آواز سے اپنی آواز کو بلند نہ کرو اور ان سے بات کرتے وقت اتنے زور سے

بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَاتَشْعُرُوْنَ ٥ (الحجرات ـ ۲)	بات نہ کرو جتنے زور سے آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہو (کہیں ایسا نہ ہو) کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

غور فرمائیے تعظیم و تکریم کی کیسی تاکید ہے کہ بلند آواز سے بات کرنے کی اجازت بھی نہیں. یہ احترام نہیں تو اور کیا ہے ؟

اس احترام کو اس قدر ملحوظ رکھنے کی تاکید کی گئی ہے کہ اگر اس کی خلاف ورزی کی گئی تو سارے اعمال حبط، گویا عدم تعظیم کو شرک سے جا ملایا کیونکہ شرک کی صورت میں بھی حبطِ اعمال کی سخت وعید سنائی گئی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ (اعراف ـ ۱۵۷)	جو لوگ رسول پر ایمان لائے، ان کا احترام کیا، ان کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو ان پر نازل کیا گیا ہے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

(عَزَّرُوْا) عَزَّرَ، يُعَزِّرُ، تَعْزِيْرٌ (باب تفعیل) کے معنی ہیں ادب و احترام کرنا۔

جو سزا ادب و احترام سکھانے کے لئے دی جائے اس سزا کو بھی لوگ تعزیر کہنے لگے ہیں حالانکہ تعزیر کے معنی تو احترام کے ہی ہیں۔

صحابہ کرامؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے حد ادب و احترام کرتے تھے، حضرت اسامہؓ بن شریک فرماتے ہیں :۔

اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ اَصْحَابُهٗ كَاَنَّمَا عَلٰى رُءُوْسِهِمُ الطَّيْرُ (ابوداؤد جزء ۲ صـ۱۸۳ سندہٗ صحیح)	میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ کے اصحاب اس طرح (بیٹھے ہوئے) تھے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کس قدر ادب و احترام کرتے تھے اب اگر ہم احترام کرتے ہیں تو یہ طنز کیا جاتا ہے کہ یہ تو بریلیوں سے بھی دو قدم آگے نکل گئے ہیں۔

الغرض ادب و احترام کے سلسلہ میں متعدد آیات و احادیث ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں تقریر کا اصل موضوع عَبَسَ کے معنی اور اس کا شانِ نزول ہے. قرآن مجید کی مذکورہ سورۃ سب ہی پڑھتے رہے لیکن اس کے جو معنی کئے گئے اس پر کسی نے نہ غور کیا اور نہ تحقیق کی زحمت گوارا کی. سوال یہ ہے کہ "عَبَسَ" کا فاعل کون ہے؟ فاعل کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بعض لوگ شاید یہ

کہیں کہ اس کا فاعل ضمیر مرفوعہ متصلہ موجود ہے۔ لیکن ضمیر میں تو اسم پوشیدہ ہوتا ہے۔ ظاہر نہیں ہوتا لہٰذا ضمیر سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کون شخص ہے جس کے لئے عَبَسَ وارد ہوا ہے۔

اگر بالفرض محال عَبَسَ کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر "عَبَسْتَ وَتَوَلَّیْتَ" کیوں نہیں کہا گیا؟ (یعنی) اے رسول آپ نے تیوری چڑھائی اور پیٹھ پھیر کر چلدئے۔ جب ایسا نہیں ہے تو پھر عَبَسَ کہہ کر کس فاعل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا فاعل کوئی اور ہے اور بلا وجہ ضمیر غائب کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھیر اگیا ہے۔

جب کہا گیا کہ اگر عَبَسَ وَتَوَلّٰی کے فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تو عَبَسَ وَتَوَلّٰی کے بجائے "عَبَسْتَ وَتَوَلَّیْتَ" ہونا چاہیئے تھا۔ تو اس کا جواب بھی گھڑ لیا گیا۔ کہنے لگے کہ اللہ تعالےٰ نے احتراماً غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایک طرف تو تم کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا عتاب نازل ہوا اور دوسری طرف کہتے ہو کہ اللہ تعالےٰ نے احتراماً کہا ہے۔

کیا یہ عجیب و غریب تضاد نہیں کہ عتاب بھی ہو رہا ہے اور احترام بھی ہو رہا ہے؟

الغرض علماء مفسرین نے ایسی سنگین اور متضاد صورتحال کی کوئی تردید نہیں کی البتہ شیعہ مفسرین نے اس کی سخت تردید کی ہے۔

شیخ طوسی تبیان میں لکھتے ہیں:۔

وَهٰذا فاسد لان النبی صلی الله علیه وسلم قد اجل الله قدرهٗ عن هٰذه الصفات وکیف یصفه بالعبوس والتقطیب وقد وصفه بانه علٰی خلق عظیم وقال ولو کنت فظًّا غلیظ القلب لا نفضوا من حولك وکیف یعرض عمن وصفه مع قوله تعالےٰ "ولا تطرد الذین یدعون ربهم بالغدٰوة والعشی یریدون وجهه" ومن عرف النبی صلی الله علیه وسلم وحسن اخلاقه وما خصه الله تعالیٰ به من مکارم اخلاقه وحسن الصحبة حتی انه

یہ فاسد ہے اس لئے کہ اللہ نے آپ کی قدر و منزلت کو ان صفات سے بلند و بالا کر دیا ہے اور وہ کیسے آپ کو عبوس اور ترش روئی سے منسوب کر سکتا ہے جبکہ اس نے آپ کا وصف یہ بیان کیا ہے کہ آپ خلقِ عظیم پر ہیں اور اس نے فرمایا ہے: اور اگر آپ ترش رو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے اردگرد سے بھاگ جاتے اور وہ ایسے شخص سے کس طرح روگردانی کر سکتے ہیں جس کے لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہو"۔ اور اے رسول آپ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے نہ نکالئے جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے رہتے ہیں" اور جو شخص آپ کو، آپ کے مکارمِ اخلاق کو جو اللہ

لم يصافح احدًا قط فينزع يده من يده حتى يكون ذٰلك الذى ينزع يده من يده فمن هٰذه الصفة كيف يقطب فى وجهه الاعمىٰ جاء بطلب الاسلام وعلٰى ان الانبياء منزهون عن مثل هذه الاخلاق لما فى ذٰلك من التنفير عن قبول قولهم وقال قوم ان هذه الايات فى الرجل من بنى امية كان واقفا مع النبى صلى الله عليه وسلم فلما اقبل ابن ام مكتوم تنفر منه وجمع نفسهٗ وعَبَسَ فى وجهه فحكى الله تعالىٰ ذٰلك وانكره معاتبة علىٰ ذٰلك (تعليقات السيد طيب الموسوى الجزائرى علىٰ تفسير القمى جلد ۲ ص۴۰۴)

تعالیٰ نے خاص طور پر آپ کو دیئے تھے اور آپ کے حسنِ صحبت کو پہچانتا ہے (وہ کبھی ترش روئی کے فعل کو آپ کی طرف منسوب نہیں کر سکتا) یہاں تک کہا گیا ہے کہ آپ جب کبھی مصافحہ کرتے تھے تو اپنا ہاتھ نہیں کھینچتے تھے جب تک دوسرا آدمی اپنا ہاتھ نہیں کھینچتا تھا تو جس کی یہ صفات ہوں وہ کیسے ایک نابینا کے آنے پر جو اسلام طلب کرنے آیا ہو بداخلاقی کر سکتا ہے اور (یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ) انبیاء اس قسم کے اخلاق سے پاک ہوتے ہیں اس لئے کہ اس سے ان کے قول کو قبول کرنے سے ایک قسم کی نفرت ہوتی ہے۔ ایک قوم نے کہا (یہ بنی امیہ کا ایک شخص تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑا تھا۔ جب ابن ام مکتوم آئے تو اس نے ان سے نفرت کی، اپنے نفس کو جمع کیا اور ان کو دیکھ کر تیوری چڑھائی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر کیا۔ اس پر عتاب کرتے ہوئے (اللہ تعالیٰ نے) اس کی برائی ظاہر کی۔

دوسرے شیعہ مفسر الفضل بن الحسن الطبرسی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

قال المرتضىٰ علم الهدى قدس الله روحه ليس فى ظاهر الآية دلالة على توجهها الى النبى صلى الله عليه وسلم هو خبر محض لم يصرح بالمخبر عنه و فيها يدل على ان المعنى بها غيره لان العبوس ليس من صفات النبى صلى الله عليه وسلم مع الاعداء المباينين فضلا عن المؤمنين المسترشدين

المرتضیٰ علم الہدیٰ قدس اللہ روحہ نے کہا آیت کے ظاہر میں اس بات کی دلالت نہیں ہے کہ اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں بلکہ یہ محض ایک خبر ہے اور جس کے متعلق خبر دی گئی ہے اس (کے نام) کی صراحت نہیں ہے بلکہ اس میں اس بات کی دلالت ہے کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کے متعلق ہے اس لئے کہ تیوری چڑھانا کھلے دشمنوں کے ساتھ بھی

فالظاھر ان قوله (عَبَسَ وَتَوَلّٰی) المراد به
غیرہٗ وقد روی عن الصادق (ع)
انها نزلت فی رجل من بنی امیہ کان
عند النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فجاءَ
ابن ام مکتوم فلما رآہ تقذر منه وجمع
نفسه وعَبَسَ واعرض بوجهه عنه فحکی
اللّٰہ سبحانه ذٰلکَ (مجمع البیان فی
تفسیر القرآن جزء ۱۰ ص ۶۶۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں سے
نہیں چہ جائیکہ مؤمنین وہدایت یاب لوگوں کے
ساتھ ہو۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول
(عَبَسَ وَتَوَلّٰی) سے کوئی اور مراد ہے۔ (امام جعفر
صادق سے روایت کیا گیا ہے کہ یہ آیت بنی امیہ
میں سے ایک شخص کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ وہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا کہ اسی
اثناء میں ابن ام مکتوم آگئے۔ جب اس نے ان
کو دیکھا تو ان سے نفرت کی۔ اپنے نفس کو جمع کیا،
تیوری چڑھائی اور ان سے منہ پھیر لیا۔ اللہ سبحانہٗ
نے اس (واقعہ) کو حکایتاً بیان کیا۔

اس کے علاوہ شیعہ مفسر استاد محسن الملقب بہ "الفیض الکاشانی" نے بھی اپنی تفسیر الصافی میں امام جعفر صادق کا وہی قول بیان کیا ہے جو مجمع البیان کے حوالہ سے اوپر نقل کیا گیا ہے (تفسیر الصافی جزء ۵ ص ۲۸۴)

دوسرے علماء کی تفسیروں میں یہ چیز نہیں ملتی جو شیعوں کی تفسیروں میں مل رہی ہے گویا فاسد باتوں کی تردید شیعہ مفسرین نے کی لیکن دوسرے علماء مکھی پر مکھی مارتے رہے۔ دوسرے علماء میں سے اگر داؤدی نے یہ کہہ بھی دیا "ھو الکافر" "تیوری چڑھانے والا کافر تھا تو حافظ ابن حجر نے یہ کہہ کر اُسے رد کر دیا: اغرب الداؤدی۔ داؤدی نے غریب یعنی اجنبی بات کہی (فتح الباری پ ۲۰ ص ۲۱۸)

الغرض دوسرے علماء نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ خود اس الزام کی کس انداز میں تردید کر رہا ہے جو علماء مفسرین نے اللہ تعالیٰ کی محبوب ترین ہستی پر لگایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔"

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ
كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ
حَوْلِكَ (آل عمران - ۱۵۹)

(اور اے رسول) یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ آپ
مؤمنین کے لئے بڑے نرم واقع ہوئے ہیں اور
اگر آپ بداخلاق وسخت دل ہوتے تو یہ آپ کے
اردگرد سے بھاگ جاتے۔

بتایئے اللہ تعالیٰ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش اخلاقی اور نرم دلی کی تعریف کر رہا ہے اور یہ کہتے ہیں آپ بداخلاقی سے پیش آئے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ قسم کھا کر فرماتا ہے :۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (القلم - ۱ تا ۴)

نٓ۔ قلم کی قسم اور اس چیز کی قسم جو لوگ لکھتے ہیں آپ اپنے رب کی نعمت سے مجنون نہیں ہیں، آپ کے لئے نہ منقطع ہونے والا اجر ہے اور بے شک آپ خلق عظیم پر (فائز) ہیں۔

غور فرمایئے کہ کیسی عظیم چیز (قلم) کی قسم کھا کر اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خُلقِ عظیم کی سند اوپر سے نازل فرما رہا ہے۔ قلم کی قسم بڑی عجیب و عظیم قسم ہے۔

بنی نوعِ انسان پر قلم کے کتنے احسانات ہیں اور اس کے کتنے عظیم الشان فوائد ہیں جس کا شمار انسان کے بس سے باہر ہے۔

آج ساری دنیا کی تاریخیں، علوم، فنون اسی قلم کی مرہون منت ہیں۔ قلم ہی کی بدولت ہر قسم کے علوم سیکھے اور سکھائے جا رہے ہیں اور یہ قلم ہی کا کارنامہ ہے کہ شریعتِ الٰہیہ کے دو ماخذ (قرآن مجید اور احادیث صحیحہ) تحریری شکل میں موجود ہیں۔

اسی طرح آیتِ مذکورہ میں لفظ عظیم بھی انتہائی غور طلب ہے۔ لفظ عظیم کی عظمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ

کہہ دیجئے کہ دنیا کا مال و متاع بہت تھوڑا ہے۔

لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرماتا ہے :-

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (نحل - ۱۸)

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ان کو گن نہیں سکتے۔

یہ قلیل نعمتوں کا عالم ہے جنہیں ہم گننے سے قاصر ہیں تو جس چیز کو عظیم کہا گیا ہے اس کی وسعتوں کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہؓ فرماتی ہیں :-

ان خلق النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان القرآن (صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق قرآن تھا۔

یعنی وہ تمام مکارمِ اخلاق اور اوصافِ حمیدہ جو قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں وہ آپ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔

رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا شدید ترین دشمن تھا اور ہمیشہ آپ کے خلاف سازشیں کرتا رہتا تھا لیکن جب اس فتنہ پرور کا انتقال ہوا تو آپ اس کی نماز جنازہ پڑھنے کھڑے ہو گئے یہی نہیں بلکہ اس کے جسم پر اپنا لعاب دہن لگایا اور اپنی قمیص

اس کے کفن کے لئے دی یہ آپ کے حلم و بردباری، عفو و درگذر اور رحم و کرم کی ایسی عظیم الشان مثال ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ صَالِحَ الْأَخْلَاقِ — مجھے اللہ تعالیٰ نے اس لئے مبعوث فرمایا ہے کہ میں اخلاق کے حقوق اور واجبات کی تکمیل کروں۔
(مسند احمد جزء ۱۷ صنف۔ صحہ احمد محمد شاکر)

الغرض ان آیات و احادیث سے واضح ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ ترین اخلاق کے منصب پر فائز تھے۔

کسی شخص کا انہیں رسول تسلیم کرنا اور ان کو بداخلاق بھی کہنا دراصل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کیونکہ اجتماع ضدین باطل ہے لہٰذا یہ دونوں باتیں کبھی بھی ایک شخص میں جمع نہیں ہو سکتیں اور پھر ایسی ہستی جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ بلند ترین اخلاق پر فائز ہیں تو پھر اس ہستی کے بارے میں کوئی تصور نہیں کر سکتا کہ وہ بداخلاقی کر سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر ان آیات کا اصل مطلب کیا ہے ؟

اول تو یہ کہ عَبَسَ کا صیغہ واحد غائب کا صیغہ ہے، مخاطب کا صیغہ نہیں ہے لہٰذا اس کے فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں۔

دوسرے یہ کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جو پہلے بیان کی جا چکی ہے صحیح سند سے مسند ابو یعلیٰ اور دوسری کتب احادیث میں موجود ہے اس میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیوری چڑھانے کا ذکر نہیں ہے۔ اس حدیث کے الفاظ پھر سن لیجئے۔

جاء ابن ابی مکتوم الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یکلم ابی ابن خلف فاعرض عنہ فانزل اللہ عَبَسَ وَتَوَلّٰی (مسند ابی یعلی جزء ۵ ص ۴۳۲)۔ سندہ صحیح۔

(عبداللہ) ابن ام مکتومؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ اس وقت ابی ابن خلف سے بات کر رہے تھے۔ ابی ابن خلف نے ان سے اعراض کیا۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی" اس نے تیوری چڑھائی اور پیٹھ پھیر کر چلا گیا۔"

مذکورہ حدیث میں نہ عتاب کا ذکر ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیوری چڑھانے اور منہ پھیرنے کا ذکر ہے۔

اس حدیث سے سارا معاملہ صاف ہو جاتا ہے کہ بداخلاقی کا مرتکب ابی ابن خلف تھا نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس۔ ابی ابن خلف نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑ کر چلا گیا۔

بہر حال اصل حقیقت کیا تھی اور کیا بنادی گئی۔

مزید برآں ابی ابن خلف والی بات کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں متعدد واقعات قرآن مجید میں موجود ہیں کہ اس قسم کی ذلیل حرکتیں کافر قوم کے سردار و رؤساء اکثر کرتے رہتے تھے اور اس قسم کی حرکتیں کفارِ مکہ کے رؤسا بھی کیا کرتے تھے وہ بھی اسی قسم کے مطالبے کیا کرتے تھے۔ یہی خصلتِ بد ابی ابن خلف میں بھی موجود تھی جب اس نے دیکھا کہ ایک نابینا اور غریب شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آیا تو فوراً حقارت سے اس کی تیوری پر بل آگئے اور اس نے منہ پھیر لیا اور پوری بات سنے بغیر ہی اٹھ کر چل دیا۔

اس شانِ نزول کی روشنی میں یہ چیز ثابت ہوگئی کہ عَبَسَ کا فاعل صرف اور صرف ابی ابن خلف تھا۔

اب تولّٰی کے معنی بھی سن لیجئے۔ تَوَلّٰی کے معنی ہیں : اعراض کیا اور چھوڑ دیا (مصباح اللغات)

توجہ نہ کرنا اور قرب کا ترک کرنا (مفردات القرآن امام راغب اصفہانی)

اعراض کیا اور ترک کیا (محیط المحیط)

ان معنوں کی روشنی میں واضح ہوا کہ تَوَلّٰی کا اطلاق اسی پر ہوگا جو اپنی جگہ چھوڑ کر چلا جائے، اس پر نہیں ہوگا جو اپنی جگہ پر موجود ہو کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو وہیں تشریف فرما تھے۔ اعراض کرنے اور مجلس کو ترک کرکے اٹھ کر جانے والا ابی ابن خلف تھا لہٰذا "عَبَسَ وَتَوَلّٰی" کا فاعل ابی بن خلف ہوا نہ کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ الغرض "تَوَلّٰی" کے معنی کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ تیوری چڑھا کر جانے والا ابی بن خلف تھا۔ اس سے اگلی آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا گیا کہ "وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى" تو یہ ایک تسلی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تھی کہ وہ (یعنی) ابی ابن خلف جاتا ہے تو جانے اس کی پرواہ نہ کریں آپ کو نہیں معلوم کہ وہ جو (نابینا) آپ کے پاس آیا ہے توقع ہے کہ وہ آپ سے پاکی حاصل کرے جبکہ اس متکبر کافر کا بھروسہ نہیں کہ وہ ایمان لائے لہٰذا آپ اس پر توجہ کریں جو آپ سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اس سے اگلی آیت میں بھی ایک تسلی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا "اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ○ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ○ آپ اس کی طرف توجہ کرتے ہیں جو پرواہ ہی نہیں کرتا۔

یہاں لفظ "تَصَدّٰى" غور طلب ہے۔

تصدّٰی کے معنی ہیں : توجہ کرنا ، صدائے بازگشت کی طرح کسی چیز کے درپے ہونا (مفردات القرآن ، امام راغب اصفہانی)

صدائے بازگشت اس آواز کو کہتے ہیں جو کسی چیز سے ٹکرا کر واپس آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آواز پیچھا کر رہی ہے۔ لہٰذا تصدّیٰ سے مراد وہ صدائے بازگشت تھی جو ابی ابن خلف کا پیچھا کر رہی تھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جانے کے بعد بھی اس کو بلا رہے تھے۔ رحمت للعالمین خیر الانام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امید تھی کہ وہ کافر ایمان لے آئے گا لیکن اللہ تعالےٰ کو معلوم تھا کہ وہ شخص آپ کی خیر خواہانہ پکار کی طرف توجہ نہیں کرے گا لہٰذا (اما من استغنیٰ) فرما کر روک دیا کہ جو شخص متکبّرانہ انداز سے منہ پھیر کر چلدے آپ اس کی طرف توجہ ہی کیوں کرتے ہیں؟ توجہ تو اس کی طرف کریں جو آپ سے پاکی حاصل کرنے آپ کے پاس چل کر آیا ہے۔

تسلّی دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ آگے فرماتا ہے :۔

وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝	اگر وہ پاکی حاصل نہیں کرتا تو آپ پر کوئی (الزام) نہیں اور جو شخص آپ کے پاس چل کر آیا ہے اور وہ ڈرتا بھی ہے تو آپ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

یعنی آپ کو اس کی طرف توجہ کرنی چاہیئے جس کے پاکی حاصل کرنے کا امکان ہو۔

اگلی آیت میں اللہ تعالےٰ نے پھر تسلی دی۔ فرمایا :۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝	ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک نصیحت ہے لہٰذا جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔

یعنی اگر وہ نصیحت حاصل کرنا نہیں چاہتا تو اس کی فکر نہ کیجیئے۔ جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کی طرف توجہ کیجیئے۔

ان آیات سے جو نتیجہ سامنے آیا وہ یہ کہ جب کبھی کسی داعی الی الحق کے سامنے ایسا مرحلہ آجائے تو اسے ایک غریب مسلم کو ترجیح دینی ہوگی خواہ اس کی مجلس میں بڑے بڑے رؤسا و اعلیٰ عہدیدار کفار ہی کیوں نہ ہوں کیوں کہ حقیقی عزّت و احترام کے مستحق مؤمنین ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (منافقون ـ ۸)	عزّت اللہ تعالےٰ کے لئے، اس کے رسول کے لئے اور مؤمنین کے لئے ہے۔

اس سلسلہ میں جو بات قابلِ ذکر ہے اسے بھی ذہن نشین کر لیجیئے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت ایسی نہیں جو بطور حکم پہلے نازل ہو چکی ہو اور جس کی خلاف ورزی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو لہٰذا کسی گناہ کا سرزد ہونا ہی بعید ہے۔ مثال کے طور پہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے :۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى	(اے رسول) اللہ آپ کو معاف کرے آپ نے

يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝
(توبہ - ۴۳)

ان (منافقین) کو (لڑائی پر نہ جانے کی) اجازت کیوں دی (اگر آپ اس وقت تک اجازت کو مؤخر کر دیتے) جب تک سچے آپ پر ظاہر نہ ہو جاتے اور جھوٹوں سے آپ واقف نہ ہو جاتے ۔

منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور مختلف قسم کے حیلے، بہانے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں جنگ میں شرکت کرنے سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دے دی لیکن اللہ عالم الغیب کو منافقین کے نفاق اور مکر و فریب کا علم تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو متنبہ کر دیا کہ اگر آپ ان کو اجازت نہ دیتے تو ان کے نفاق کا بھانڈا سر راہ پھوٹ جاتا کیونکہ یہ جھوٹے کسی حالت میں بھی جنگ کرنے نہ جاتے ۔

بتائیے اس میں کیا غلطی ہے ؟ اگر اللہ تعالیٰ پہلے یہ حکم نازل فرما دیتا کہ "ان منافقین کو ہرگز اجازت نہ دینا" ۔ اس حکم کے بعد اگر اجازت دی جاتی تو یقیناً یہ گناہ ہوتا ۔

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے ۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے عبداللہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے منافق باپ کی نماز جنازہ پڑھانے اور مغفرت کی درخواست کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی درخواست کو منظور فرمایا اور نماز جنازہ پڑھانے کھڑے ہو گئے ۔ حضرت عمرؓ نے آپ کا دامن پکڑ کر عرض کیا اے اللہ کے رسول یہ تو منافق ہے اس نے فلاں دن یہ یہ کہا اور اس کی کئی ناشائستہ باتیں گنوانے کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں گے ؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :- اللہ تعالیٰ نے مجھے (دعاء کرنے یا نہ کرنے کا) اختیار دیا ہے (منع نہیں کیا) جیسا کہ ارشاد باری ہے :-

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ، اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ
(توبہ - ۸۰)

آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں اگر آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ ان کو معاف نہیں کرے گا ۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :- اگر میں سمجھتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے یہ بخش دیا جائے گا تو میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتا ۔ یہ فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھا دی ۔

اسی وقت اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اور فرمایا :-

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (توبہ - ۸۴)
(صحیح بخاری کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ براءۃ)

(اے رسول) منافقین میں سے جب کوئی مر جائے تو آئندہ آپ کبھی اس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور نافرمانی کی حالت میں مر گئے۔

معلوم ہوا کہ اس حکم سے پہلے استغفار کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں تھا لیکن جب ممانعت کا حکم نازل ہوا تو آپ نے اس فعل کو ترک کر دیا۔ مگر بالفرض محال اب بھی ترک نہ کرتے تو گناہ کا صدور ہوتا۔

اسی طرح جنگ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالٰے نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

یہ غلط تاثر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیدیوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے مشورہ لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: یہ ہمارے چچا کی اولاد ہیں اور ہمارے خاندان کے ہی افراد ہیں میری رائے تو یہ ہے کہ آپ ان کو کچھ مال کے عوض چھوڑ دیجئے تاکہ اس مال سے آئندہ کفار سے مقابلہ کرنے کے لئے سامانِ جنگ خریدا جا سکے اور شاید اللہ تعالٰے (بعد میں) انہیں اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اے خطابؓ کے بیٹے تمہاری کیا رائے ہے؟ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اللہ کی قسم میری وہ رائے نہیں جو ابوبکرؓ نے دی ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ انہیں ہمارے حوالے کریں تاکہ ہم ان کی گردنیں اڑا دیں۔ عقیلؓ کو علیؓ کے حوالے کیجئے تاکہ وہ انہیں قتل کر دیں اور مجھے میرے فلاں عزیز کو دیجئے تاکہ میں اس کی گردن اڑا دوں اور یہ بہت ضروری ہے کیونکہ یہ کفر کے سردار ہیں اور اس کے مہرے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے پسند آئی۔ آپ نے حضرت عمرؓ کی رائے کو پسند نہیں فرمایا (صحیح مسلم کتاب الجہاد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں حلم اور عفو و درگذر بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا لہٰذا آپ نے ان کے قتل کو پسند نہیں فرمایا لیکن اللہ تعالٰے کو فدیہ لے کر چھوڑنے والا عمل پسند نہیں آیا۔ تو یہ آیت نازل فرمائی:۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى

نبی کے یہ شایانِ شان نہیں کہ اس کے قبضہ میں

حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (انفال ـ ۶۷)
قیدی ہوں جب تک کافروں کو خوب قتل (کرکے ملک میں اپنا رعب) نہ (قائم) کرلے۔

اصل میں بات کیا تھی؟ اس پر کسی نے غور نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ نے جنگِ بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں ایک خاص حکم کو مخفی رکھا تھا۔ اُسے پہلے ظاہر نہیں کیا یعنی اس حکم کو اس وقت نازل فرمایا جب فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دینے کی کارروائی عمل میں آچکی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے جس حکم کو بعد میں نازل فرمایا وہ درج ذیل ہے۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا (انفال ـ ۶۸)
اگر اللہ نے پہلے سے یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا (کہ تمہیں معاف کر دیا جائے گا) تو جو مال تم نے لیا اس کی وجہ سے تم پر بڑا عذاب نازل ہوتا (خیر جو ہوا سو ہوا اب) جو مالِ غنیمت تمہیں ملا ہے تم اسے حلال و طیّب سمجھ کر کھا سکتے ہو۔

ظاہر ہے کہ حکم بعد میں نازل ہوا تو اس حکم کی نافرمانی کیسے ہوئی؟

جب نافرمانی ہی نہیں ہوئی تو عتاب یا ناراضگی کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے۔ اگر نافرمانی ہوتی تو عذاب نازل ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا جو منشا تھا وہ بعد والوں کے لئے حکم بن گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اگر نبی کے پاس قیدی ہوں تو یہ ضروری ہے کہ ان کو اچھی طرح قتل کر دیا جائے تاکہ دشمن پر مسلمین کی دھاک بیٹھ جائے اور وہ اتنا کمزور ہو جائے کہ آئندہ مقابلہ کی جرأت نہ کر سکے لیکن یہ حکم بعد میں نازل ہوا تو اس حکم کی خلاف ورزی کیسے ہوئی؟ اور جب خلاف ورزی نہیں ہوئی تو گناہ کیسے ہوا؟

البتہ ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی جن لوگوں نے دنیا طلبی کے لئے فدیہ لے کر چھوڑنے کی رائے دی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (انفال ـ ۶۷)
تم دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کرنے کا حکم تھا۔ آپ نے مشورہ کیا اور مشورہ ہی کے مطابق عمل کیا اس میں کون سی غلطی تھی؟

الغرض قرآن مجید میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے جو پہلے نازل ہو چکا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خلاف ورزی کی ہو۔ جب ایسا نہیں ہے تو پھر معصوم عن الخطاء نبی برحق صلی

اللہ علیہ وسلم کو گناہ گار ثابت کرنا اور قرآن مجید کی آیات کو غلط معنی پہنانا زیادتی ہی نہیں بلکہ بہت بڑا کفر ہے۔

مرتب : محمد یوسف ۔ مدیر "المسلم"

برسبیل تذکرہ

لوگ ہم سے اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ تو کہتے ہیں کہ امام بنانا تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے تو پھر بتایئے کہ آپ کیسے امام بن گئے؟ آپ کو کس نے امام بنایا؟

یہ عجیب و غریب اعتراض ہے۔ اللہ تعالیٰ تو وہ امام بناتا ہے جو اپنے قول و فعل میں قطعی معصوم ہو۔ جس کا ہر فقرہ ضابطۂ حیات ہو، جس کی ہر ادا منظور شدہ ہو، جس کے لئے اللہ تعالیٰ خود گواہی دے کہ میرے بنائے ہوئے امام رسول نبی والی کی پیروی کرو گے تو ہدایت ملے گی ورنہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا امام قیامت تک کے لئے ہے، ان پڑھ ہونے کے باوجود جاہل نہیں بلکہ ایسا جامع عالم کہ ان جیسا عالم آج تک نہ پیدا ہوا اور نہ ہوگا۔

بتایئے کہاں وہ امام اور کہاں انسانوں کے بنائے ہوئے امام۔ اس واضح اور روشن حقیقت کے ساتھ ساتھ معترض حضرات اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھیں کہ دنیا والے جس کو امام بناتے ہیں خواہ وہ کسی جماعت کا امام یا امیر ہو یا کسی مسجد کا امام ہو یا کسی علم و فن میں مہارت تامہ رکھنے کی بنیاد پر امام بنایا گیا ہو وہ مَا یَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّا حَقٌّ کا مصداق ہرگز نہیں اور نہ ہی وہ قیامت تک کے لئے واجب الاطاعت ہوتا ہے۔ وہ صرف عارضی اور ایک خاص مدت کے لئے امام ہوتا ہے۔

مزید برآں دنیا والے جس کو امام بناتے ہیں وہ ان پڑھ نہیں ہوتا بلکہ عموماً کسی دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے کی سند کی بنیاد پر امام بنایا جاتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ اعتراض لغو بھی ہے اور منصب امامت کی اصل روح کو نہ سمجھنے کا شاخسانہ بھی ہے۔

رہا یہ اعتراض کہ آپ کو کس نے امام بنایا؟ تو یہ اعتراض برائے اعتراض ہے۔ بہرحال مجھے تو ان لوگوں نے امام بنایا جو میری طرح فرقوں سے بیزار تھے اور یہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ بغیر امیر یا امام کوئی جماعت چل نہیں سکتی لہٰذا میرا انتخاب بھی دین کی ایک ضرورت کے تحت کیا گیا ہے۔

دنیا والے جب نمازِ باجماعت کے لئے کسی امام کو منتخب کرکے اسے منصب امامت تفویض کر سکتے ہیں تو کیا کسی ایسی جماعت کے لوگ جو خالص دینِ اسلام کا داعیہ لے کر اٹھے ہوں کسی امام کا انتخاب نہیں کر سکتے؟

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

جماعت المسلمین کی دعوت

ہمارا حاکم	صرف ایک	یعنی : اللہ تبارک وتعالےٰ	.. اللہ کے سوا کوئی نہیں
ہمارا امام	صرف ایک	یعنی : محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	.. فرقہ وارانہ امام نہیں
ہمارا دین	صرف ایک	یعنی : اللہ کا پسند کردہ دین اسلام	.. فرقہ وارانہ مذہب نہیں
ہمارا نام	صرف ایک	یعنی : اللہ کا رکھا ہوا نام مسلمین	.. فرقہ وارانہ نام نہیں
بنیادِ محبت	صرف ایک	یعنی : اللہ تعالےٰ سے تعلق	.. دنیوی تعلقات نہیں
وجہِ افتخار	صرف ایک	یعنی : ایمان باللہ العظیم	.. وطن اور زبان نہیں

اگر آپ ہماری اس دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں۔
تعارفی پمفلٹ مفت طلب فرمائیں۔

جماعت المسلمین
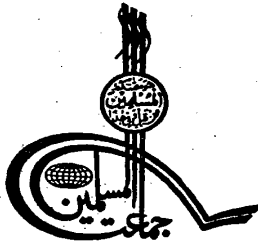
JAMAAT-UL-MUSLIMEEN [INDIA]

[Preaching pure and unadulterated Islam]

www.india.aljamaat.org

MARKAZ JAMAAT-UL-MUSLIMEEN (HIND)
Plot #14, Masjid Jamaat-ul-Muslimeen
IDPL Colony, Dilkhushnagar, Old Bowenpally,
Secunderabad – 500 037 (A.P.)
Cell:91-92463-43643/91-40-6508-1395/91-40-2356-9224